



فہرست

ادب و مزاح

۱. بے چین.....

اکتشافات

۲. نیولین.....

سائنس / ٹیکنالوجی

۵. ہائی ٹیک.....

معاشرہ اور ثقافت

۷. خواتین کا عالمی دن.....

۹. سوشل میڈیا کے دانشور.....

۱۰. عورت.....

بے چین مصنف: علی

میکوئن نے سامنے بیٹھے امیدوار کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ دبلا پتلا گندی رنگت کا آدمی کام کی تلاش میں آیا تھا۔ میکوئن نے اُسے بتایا کہ یہ کام بہت مشقت والا اور عارضی ہے تمہیں نقد ادائیگی کی جائے گی۔ یہ پرانی عمارتیں گرانے کا کام ہے جس میں خطرہ بھی ہے لیکن بیمہ یا صحت کے علاج کے سلسلے میں ممداری کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

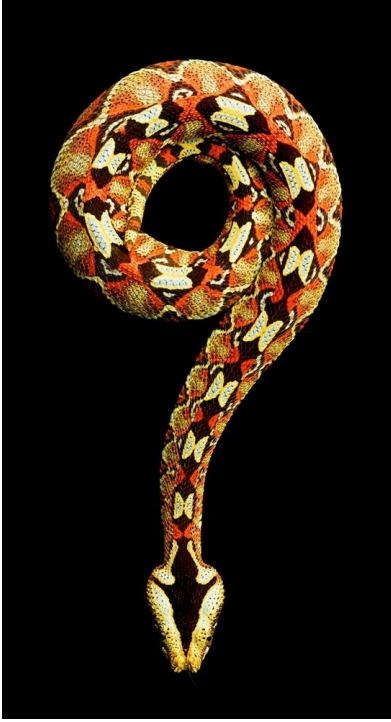


رام لعل نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس کا تعلق بھارتی علاقے راجستھان کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ وہ طب کی تعلیم پانے آئرلینڈ آیا تھا۔ اس کا آخری سال تھا، اپنی ضروریات پورا کرنے کی خاطر اُسے مزید آمدن درکار تھی۔ اسی لیے وہ ٹھیکیدار کے دفتر عارضی ملازمت حاصل کرنے آیا تاکہ موسم گرما کی چھٹیوں میں کچھ آمدن حاصل کر سکے۔ میکوئن نے رام لعل سے کہا، وہ کل سے کام پر جائے۔ اوقات صبح ۷ بجے سے شام کے ۷ بجے ہیں۔ تمام مزدوروں کو ٹرک صبح ۶ بجے اسٹیشن کے سامنے سے لیتا ہے۔ ان کا انچارج بل کیمرن ہے، میں اسے بتا دوں گا۔ رام لعل دفتر سے باہر آیا اور ایک کمرہ تلاش کرنے لگا۔ کوشش کے بعد اسے اسٹیشن کے قریب ایک کمرہ مل گیا۔ اتوار کے روز وہ اپنے مختصر سامان کے ساتھ اس کمرے میں منتقل ہو گیا۔ دوپہر کے وقت وہ بستر پر لیٹا اپنے گائوں کی پہاڑیوں، کھیتوں اور کسانوں کو یاد کرتا اور سوچتا رہا تھا کہ جلد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر بن کر گائوں چلا جائے گا۔ پیر کی صبح رام لعل جلدی اٹھا اور ۶ بجے کے قریب مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرک پہنچ گیا۔ اس وقت تک ۱۲ افراد جمع ہو چکے تھے۔ رام لعل کچھ دور ہٹ کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں گروپ انچارج بھی پہنچ گیا۔ اس کے پاس مزدوروں کی فہرست تھی اور وہ سب کو جانتا تھا۔ رام لعل اُس کے قریب پہنچا تو فورمین نے پوچھا ”کیا تم وہی کالے آدمی ہو جسے میکوئن نے ملازم رکھا ہے۔“ اس نے کہا ”ہاں میں ہی ہری کشن رام لعل ہوں۔“ فورمین بل کیمرن کا رویہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار تھا۔ اس کا قد ۶ فٹ ۳۳ انچ اور جسم طاقتور تھا، شکل سے

بھی وہ ایک پہلوان معلوم ہوتا۔ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اس نے حقارت سے زمین پر تھوکا اور رام لعل سے کہا ”جاؤ ٹرک میں بیٹھو۔“ دوران سفر ایک شخص نے پوچھا ”تم کہاں سے آئے ہو۔“ اس نے کہا ”بھارت کے علاقے راجستھان سے۔“ آدمی نے پوچھا ”کیا تم عیسائی ہو؟“ رام لعل نے کہا ”میں ہندو ہوں۔“ اس شخص نے پھر جس کا نام برنس تھا، باقی لوگوں سے رام لعل کا تعارف کرایا۔ ایک شخص نے کہا ”تمہارے پاس کھانا نہیں ہے؟“ رام لعل نے کہا ”میں کل سے لاؤں گا۔“ دوسرے شخص نے پوچھا ”کیا تم نے ایسا مشقتی کام پہلے کیا ہے؟“ رام نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس شخص نے کہا ”تمہیں مضبوط جوتے اور دستاں بھی خریدنے ہوں گے۔“ باتوں باتوں میں رام لعل نے بتایا کہ وہ طب کا طالب علم ہے اور اسے مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے تاکہ کچھ زائد آمدن حاصل کر سکے۔ ٹرک ڈوبلڈ روڈ پر ایک کچے راستے پر درختوں کے قریب رک گیا۔ وہاں کومبر کے کنارے شراب کی ایک پرانی فیکٹری تھی جسے گرایا جاتا تھا۔ عمارت کے مالک کی خواہش تھی کہ کم سے کم رقم خرچ ہو۔ لہذا اس نے کسی بڑی کمپنی کے بجائے ٹھیکیدار میکوئن سے بات کی جو مناسب رقم میں بغیر مشینری کے عمارت گرانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میکوئن کے مزدوروں نے یہ کام بھاری ہتھوڑوں اور کدالوں کی مدد سے کرنا تھا۔ میکوئن کو یہ بھی لالچ تھا کہ عمارت ٹوٹنے سے نکلنے والی لکڑی اور سیکڑوں ٹن اینٹیں فروخت کر کے اضافی آمدنی حاصل ہوگی۔ مزدور اوزار اٹھائے عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے پاس بڑے ہتھوڑے، لمبی چھینیاں اور رے تھے۔ فورمین نے کہا ”چلو بھی کام شروع کرو۔ ہم سب سے پہلے چھت کی ٹائلیں توڑیں گے۔“ رام لعل نے اندر چھت دیکھی جو کسی چار منزلہ عمارت کے برابر اونچی تھی۔ اسے اونچائی سے خوف آتا تھا۔ ایک آدمی نے پرانی لکڑی کا دروازہ توڑا اور آگ جلا کر چائے کا پانی رکھا۔ سب لوگوں نے تام چینی کے مگ نکالے اور چائے پینے لگے۔ رام لعل نے سوچا کہ کل وہ مگ بھی خرید لے گا۔ تاہم برنس نے اپنے مگ میں رام لعل کو چائے دی۔ چھت پر کام شروع ہو گیا۔ ٹائلیں اکھاڑ کے نیچے پھینکی جانے لگیں۔ ۱۲ بجے کے بعد کھانے کا وقفہ ہوا اور سب لوگ نیچے آ گئے۔ چائے بنی اور رام لعل کے سوا سب مزدوروں نے کھانا کھایا۔ اس نے اپنے ہاتھ دیکھے جو جگہ جگہ سے چھل گئے تھے اور سارا جسم دکھ رہا تھا۔ برنس نے رام لعل سے کہا ”وہ تم بھی سینڈوچ کھا لو، میرے پاس کافی ہیں۔“ بل کیمرن سامنے بیٹھا تھا، اس نے برنس سے کہا ”تم کیا کر رہے ہو۔ کالے کو اپنا کھانا خود لائے دو، تم صرف اپنی فکر رکھو۔“ برنس نے اپنی نظریں جھکائیں کیونکہ کوئی بھی فورمین کے آگے نہیں بول سکتا تھا۔ پورے ہفتے کام چلتا رہا۔ عمارت کی چھت، دیواریں، دروازے اور کھڑکیاں نیچے ملے کے ڈھیر پر گرتی رہیں۔ رام لعل کے لیے یہ سخت محنت کا کام تھا، ہاتھ زخمی ہو گئے

لیکن رقم کی خاطر وہ محنت کرتا رہا۔ اس دوران فورمین بل کیمرن جسے لوگ ”بگ بلی“ بھی کہتے تھے، رام لعل کے پیچھے لگا رہا۔ مشکل سے مشکل کام اسے دیا جاتا اور وہ بے عزتی کرنے کا بھی کوئی موقع ضائع نہ کرتا۔ ہفتے کے روز تک اندر کا کام پورا ہو چکا۔ اب باہر کی دیواریں باقی تھیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دیواروں میں نیچے ڈائنامٹ لگایا جاتا تو ایک ساتھ پورا ملبہ نیچے آ گرتا۔ لیکن میکوئن کے لیے یہ طریقہ ناقابل عمل تھا۔ اس کے لیے لائسنس کی ضرورت تھی جو شمالی آئرلینڈ میں مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ محکمہ ٹیکس اور انشورنس والوں کو بھی ادائیگی کرنا پڑتی۔ لہذا یہ سارا کام مزدوروں کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔ خود کو خطرہ میں ڈالنے دیواریں ہتھوڑوں سے توڑ رہے تھے۔ کھانے کے وقت فورمین نے ادھر ادھر گھوم کر کام کا جائزہ لیا اور پھر کہا کہ اس طرف کی دیوار کا بڑا حصہ پہلے توڑنا ہے۔ پھر وہ رام لعل کی طرف مڑا اور کہا ”میں چاہتا ہوں کہ تم اوپر چڑھو اور جب دیوار گرنے لگے تو اسے باہر کی طرف دھکا دو۔“ بل کیمرن جانتا تھا کہ رام لعل اونچائی سے ڈرتا ہے۔ رام لعل نے جواب دیا ”اس پوری دیوار میں دراڑ پڑی ہوئی ہے۔ جو بھی اوپر گیا، وہ اس کے ساتھ ہی گرے گا۔“ بل کیمرن کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، وہ چیخ کر بولا ”تم مجھے میرا کام مت سمجھاؤ۔ کالے آدمی، جیسا تم سے کہا، وہی کرو۔“ رام لعل اٹھا اور فورمین کے سامنے جا کر بولا ”مسٹر کیمرن! ایک بات صاف ہوئی چاہیے۔ میرا تعلق راجپوت قبائل سے ہے۔ گو اس وقت میرے پاس تعلیمی اخراجات کے لیے رقم کم ہے لیکن میرے آباء واجداد میں دو ہزار سال قبل راج، مہاراج، شہزادے اور فوج کے سپہ سالار گزرے ہیں۔ اس وقت تم لوگ بندروں کی طرح چاروں ہاتھ پیر پر چلنے اور کپڑوں کی جگہ کھال پہنتے تھے۔ براہ مہربانی آپ میری بے عزتی کرنا بند کر دیں۔ ہر انسان کی اپنی عزت ہوتی ہے جس کی حفاظت اس کا فرض ہے۔“ رام لعل کی یہ مختصر تقریر سب لوگوں نے دم بخود سنی۔ بل کیمرن کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے چیخ کر گالی دی اور کہا ”اچھا تو تم واقعی عزت دار تھے۔“ ساتھ ہی اس نے رام لعل کے منہ پر اٹلے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کیا۔ پتھارا رام لعل زمین سے اڑ کر کئی فٹ دور جا گرا۔ برنس کی آواز آئی ”لو کے زمین سے اٹھنا مت، ورنہ بگ بلی تمہیں جان سے ہی مار دے گا۔“ رام لعل نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیوڑیوں بل کیمرن مٹھیاں بند کئے اس کے اٹھنے کا منتظر تھا۔ رام لعل کا اس سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموشی سے پڑا رہا۔ ڈھک اور بے عزتی کی تکلیف سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بند آنکھوں سے رام نے خود کو وطن میں پایا جہاں اس کے آباء واجداد گھوڑوں پر سوار، تلواروں اور نیزوں سے لیس آس پاس سے گزرتے اسے صرف ایک لفظ کہہ رہے تھے ”انتقام، انتقام۔ تمہیں اپنی بے عزتی کا انتقام لینا ہوگا۔“

کیمرن کی جیکٹ کی داہنی جیب میں الٹا اور فوراً واپس آکر کام میں لگ گیا۔ کھانے کے دوران سب لوگ دائرے میں بیٹھ کر سینڈوچ کھانے لگے۔ رام لعل کا دل کھانے میں نہیں لگ رہا تھا، وہ زبردستی سب کے ساتھ بیٹھا۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر فورمین کی جیکٹ کی طرف دیکھتا۔ آخر کار بل کیمرن نے کھانا ختم کیا، اٹھ کر اپنی جیکٹ کی طرف گیا اور داہنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔



چند سیکنڈ بعد اس نے پائپ اور تمباکو کی تھیلی نکالی، پائپ بھر کر جلایا اور پینا شروع کر دیا۔ رام لعل مایوسی اور ناامیدی کا شکار تھا کہ اس کی چال نے اپنا کام نہیں دکھایا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بے یقینی سے جیکٹ کی طرف دیکھا۔ اسے چند سیکنڈ کے لیے جیکٹ کے ایک کنارے پر کوئی چیز چلتی نظر آئی۔ جیکٹ کی جیب میں پائپ جانے والے چھوٹے سے سوراخ سے سانپ نکل کر اندرونی سلائی میں چھپ گیا۔ شام کو واپسی کے وقت فورمین نے اپنی جیکٹ اتار کر اپنے برابر رکھ لی اور مقررہ مقام پر سب لوگ اتر کر اپنے گھر جانے لگے۔ رام لعل نے برنس سے پوچھا کہ کیا بل کیمرن کے بیوی بچے ہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ رام لعل اپنے کمرے پہنچا اور دل سے دعا کرنے لگا کہ میں اپنی بے عزتی کا بدلہ بل کیمرن سے لینا چاہتا تھا لیکن اس کے بیوی بچوں کو نقصان پہنچانا میرا مقصد ہرگز نہیں۔ اتوار کا دن بھی انہی سوچوں میں گزر گیا۔ پیر کی صبح بل کیمرن اور اس کے بیوی بچے صبح ۶ بجے کے قریب اٹھے اور ناشتا کرنے باورچی خانے میں جمع ہو گئے۔ بل کیمرن کام پہ جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس نے بیٹی سے کہا کہ ذرا میری جیکٹ

بنتے واپس آ سکتا ہوں۔“ ٹھیکیدار نرم دل آدمی تھا، اس نے کہا ”ٹھیک ہے! تم جا سکتے ہو۔ اگر تم وعدے کے مطابق واپس پہنچ جاتے ہو تو انہی شرائط پر دوبارہ کام شروع کر دیتا۔“ رام لعل نے شکریہ ادا کیا اور واپس آگیا۔ اگلے روز اس نے اپنے سکھ دوست سے رقم ادھار لی اور بذریعہ ریل لندن پہنچ کر بھارت جانے کے لیے ٹکٹ خرید لیا۔ اس طرح ۲۴ گھنٹوں کے اندر وہ بمبئی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ایک دکان پر پہنچا جہاں پالتو پرندے، سانپ اور دیگر جانور فروخت ہوتے تھے۔ اسے دراصل ایک چھوٹے زہریلے سانپ کی تلاش تھی۔ دکاندار نے بتایا کہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ کل ہی میرے پاس ایک چھوٹا سانپ آیا ہے جو آراکھیراٹاگ (Saw Scaled Viper) کہلاتا ہے۔ یہ سانپ مغربی افریقہ سے عرب، ایران، پاکستان اور بھارت کے خشک اور نم علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۰-۱۵ سینٹی میٹر تک، رنگ گہرا بھورا اور جسم پتلا ہوتا ہے۔ زہریلے دانت شکار کی جلد پر سوئی جیسے دو سوراخ چھوڑتے ہیں۔ زہر اتنا تیز اثر ہوتا ہے کہ دو تین گھنٹوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ موت کا سبب دماغ میں خون کا اخراج ہوتا ہے۔ رام لعل نے دکان کے مالک سے پوچھا کہ اس سانپ کی کیا قیمت لوگے؟ کچھ دیر بحث کے بعد سودا ۳۵۰ روپے میں طے ہو گیا۔ رام لعل سانپ کو ایک ڈھکن والی بوتل میں بند کر کے گھر چلا آیا۔ لندن سفر کے لیے رام لعل نے ایک سگار بکس خریدا۔ اسے خالی کر کے اس میں پندرہ چھوٹے سوراخ کیے اور سانپ نرم پتوں کے ساتھ سگار بکس میں بند کر کے اسے اچھی طرح ٹیپ سے بند کر دیا۔ اس طرح لندن واپسی کا سفر شروع ہوا۔ شام تک رام لعل اپنے کمرے میں بیٹھ چکا تھا۔ اس نے سگار بکس نکال کر دیکھا۔ سانپ بالکل صحیح حالت میں سیاہ چمک دار آنکھوں سے رام لعل کو گھور رہا تھا۔ رام لعل نے شیشے کا ایک ڈھکن دار مرتبان خالی کیا تاکہ صبح استعمال کیا جائے۔ صبح جلدی اٹھ کر اس نے انتہائی احتیاط سے سانپ کو سگار بکس سے مرتبان میں منتقل کیا۔ مضبوطی سے ڈھکن لگایا اور اسے اپنے لُچ بکس میں حفاظت سے رکھ دیا۔ مقررہ وقت وہ اسٹیشن پہنچا جہاں سے ٹرک سب مزدوروں کو لیے کام کی جگہ جاتا تھا۔ بل کیمرن کی یہ عادت تھی کہ کام شروع کرنے سے پہلے وہ اپنی جیکٹ اتار کر کسی شاخ پہ اتار دیتا تھا۔ کھانے کے وقفے میں وہ جیکٹ کی جیب سے اپنا پائپ اور تمباکو کی تھیلی نکال کر پائپ ضرور پینا۔ رام لعل کا ارادہ تھا کہ وہ موقع پا کر سانپ کو بل کیمرن کی جیکٹ کی جیب میں چھوڑ دے گا۔ پھر وہ جیکٹ کی جیب سے پائپ اور تمباکو نکالے گا۔ اس دوران سانپ بل کیمرن کو ڈس لے گا۔ بل کیمرن گہرا کر ہاتھ جیب سے نکالے گا، تو سانپ اس کے ہاتھ سے لٹکا ہوگا کیونکہ اس کے دانت گوشت میں گڑے ہوں گے۔ منصوبے کے مطابق رام لعل کسی بھانے ۱۱ بجے کے قریب اٹھا۔ اپنا لُچ بکس کھول کر سانپ کا مرتبان نکالا، ڈھکن کھول کر بل

رام لعل خاموشی سے اٹھا اور کام میں لگ گیا۔ سارا دن نہ وہ کسی سے بولا اور نہ کوئی بات کی۔ اس رات جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو باہر گرج چمک رہی تھی اور طوفانی بارش کے آثار تھے۔ وہ بستر پر لیٹ گیا اور کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس سے انتقام لے سکے۔ تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہونے لگی۔ اس کی نظر کھڑکی کے شیشے پر پڑی جہاں بارش کی بوندیں ایک قطار کی شکل میں بننے لگی تھیں۔ شیشے پر پڑی مٹی کی وجہ سے پانی کی قطار سیدھی کے بجائے لہراتی ہوئی بننے لگی۔ اچانک رام لعل کی نظر کونے پر پڑی ڈریسنگ گائون کی ڈوری پہ گئی جو ہوا سے نیچے گر گئی تھی۔ گری ڈوری ایسی لگتی تھی کہ پتلا سانپ کندلی مارے بیٹھا ہو۔ رام لعل سمجھ گیا کہ اسے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ اگلے روز رام لعل بذریعہ ریل بیلغاسٹ گیا اور اپنے سکھ دوست سے ملا۔ رنجیت سکھ بھی اس کی طرح طالب علم تھا لیکن اس کے والدین دولت مند تھے اور اسے ماہانہ اچھی رقم اخراجات کے لیے بھیجتے۔ رام لعل نے اس سے کہا کہ مجھے گھر سے اطلاع ملی ہے، میرے والد بستر مرگ پر ہیں۔ میں سب سے بڑا بیٹا ہوں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے واپس ہندوستان جانا ہوگا۔ رنجیت سکھ نے کہا کہ ہاں یہی روایت ہے کہ والد کے انتقال کے وقت بڑا بیٹا اس کے پاس ہو۔ رام لعل نے کہا، میرا مسئلہ ہوائی سفر کے ٹکٹ کا ہے۔ میں کام بھی کر رہا ہوں لیکن میرے پاس کافی پیسے نہیں۔ کیا تم مجھے کچھ رقم ادھار دے دو گے؟ میں زلدی کام کر کے تمہاری رقم لوٹا دوں گا۔ سکھ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، میں کل ٹیک سے رقم نکلا کر تمہیں دے دوں گا۔ اس روز شام کو رام لعل اپنے ٹھیکیدار مسٹر میکون سے ملا اور اپنے والد کے بارے میں بتایا کہ اس کا آخری وقت قریب ہے۔



میں اس سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا مذہبی طریقہ ہے کہ مرنے والے کی آخری رسوم اس کا بڑا بیٹا ادا کرے۔ رام لعل نے یہ بھی کہا ”میں نے ہوائی کرائے کی رقم دوست سے ادھار لی ہے۔ اگر میں کل کی پرواز سے روانہ ہو جاؤں تو اگلے

منصوبے کے مطابق تسمیں کام کرنے کے بعد مر جانا تھا۔ کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ ابھی نہیں تو کچھ عرصے بعد تم مر جاؤ گے۔ بغیر مادہ کے تمہاری نسل آگے نہیں چل سکتی کیونکہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پائے جاتے۔

سے ہنسنے لگے۔ رام لعل نے ان سے کہا: ”یقین کرو، یہ انتہائی زہریلا سانپ ہے۔“ بل کیمرون کی آنکھوں میں ہنسنے ہنسنے آنسو آگئے۔ وہ رام لعل سے کہنے لگا: ”مکالے آدمی، تم تو بہت ہی بے وقوف ہو۔ کیا تسمیں نہیں معلوم کہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔“ بگ بلی ہنسنے ہنسنے کچھ تھک گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ گھاس پر لیٹ گیا کہ چند منٹ آرام کر لے۔ تب اسے معمولی جھپٹ کا بھی احساس نہیں ہوا۔ اس کی داہنی ٹکائی پر سوئی کی نوک کے برابر دو انتہائی باریک سوراخ ہو چکے تھے۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ سب لوگ کام کے لیے اٹھ گئے۔ عمارت توڑنے کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سارا ملہ ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔ دو گھنٹے بعد بل کیمرون نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا، اسے کچھ پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہتھوڑا ہاتھ سے رکھا اور اپنے ساتھی سے کہا ”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ میں ذرا دیر سایہ میں آرام کر لیتا ہوں۔“ پھر وہ درخت کے نیچے بیٹھا سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ ہٹھکے ہٹھکے اس کے پورے جسم کو جھکا لگا اور وہ پیچھے کی طرف الٹ کر گر۔ سب سے پہلے برنس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پیٹرن کو آواز دی اور کہا: ”بگ بلی بہت بیمار لگ رہا ہے۔ میری بات کا اُس نے جواب بھی نہیں دیا۔“ سب مزدوروں نے کام چھوڑ دیا اور اس درخت کے پاس آگئے جہاں بل کیمرون زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن اُن میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ پیٹرن نے رام لعل کو آواز دی کہ ابھر آؤ اور اسے دیکھو۔ تم طب کے طالب علم ہو، تمہارا کیا خیال ہے؟ رام لعل کو کسی معاینے کی ضرورت تو نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے جھک کر نبض دیکھی اور پیٹرن سے کہا کہ یہ تو مر چکا۔ پیٹرن نے کہا ”سب لوگ یہیں ٹھہریں۔ میں ایبولینس بلاتا اور ٹھیکیدار میکوش کو بھی مطلع کرتا ہوں۔“ وہ پھر پیدل سڑک کی طرف روانہ ہوا تاکہ ہاتھ سے فون کر سکے۔ ایبولینس کے پہنچنے پر بل کیمرون کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے معاینہ کیا اور بتایا کہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس شخص کی موت واقع ہو چکی۔ میکوش بھی پریشانی کے عالم میں ہسپتال پہنچ گیا۔ پولیس اور عدالتی کارروائی میں چند روز لگے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق بل کیمرون کی موت قدرتی طور پر ہوئی۔ وجہ دماغ میں شدید اخراج خون تھا۔ عیسائی مذہب کے طریقے کے مطابق تدفین ہوئی جس میں اس کے خاندان، میکوش اور دیگر ساتھی بھی شریک ہوئے۔ رام لعل نے تدفین میں شرکت نہیں کی بلکہ وہ اس مقام پر جا پہنچا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ گھاس میں کھڑے ہو کر دل ہی دل میں کچھ کہنے لگا ”اے زہریلے سانپ! کیا تم میری بات سن سکتے ہو۔ تم نے وہ کام کر دکھایا جس کے لیے تسمیں راجستھان کی پہاڑیوں سے یہاں لایا گیا تھا۔ میرا انتقام پورا ہو گیا۔ میرے

تو لانا۔ وہ الماری سے نکال کر لائی۔ بل نے کہا: ”اسے دروازے کے پیچھے ٹانگ دو۔ میں ابھی لیتا ہوں۔“ جب بیٹی نے جیکٹ ٹانگی تو وہ پھسل کر باورچی خانے کے فرش پر گر پڑی۔ بلی نے غصے سے کہا ”تم سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ جیکٹ اٹھا کر اچھی طرح ٹانگو۔“ ”بابا، یہ آپ کی جیکٹ سے کیا چیز گری۔“ بگ بلی کی بیوی، بیٹے اور سب نے اس طرف دیکھا۔ ایک چھوٹا سا جاندار فرش پر پڑا چمکیلی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ باریک دو شاخہ زبان لہراتی نظر آ رہی تھی۔ بل کی بیوی بولی ”خدا ہمیں محفوظ رکھے، یہ تو کوئی سانپ ہے۔“ بل کیمرون غصے سے بولا: ”پاگل نہ بنو، کیا تسمیں معلوم نہیں کہ آئرلینڈ میں قدرتی طور پر کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔ ہر شخص یہ بات جانتا ہے۔“ پھر اُس نے بیٹے سے پوچھا: ”بوی، تم تو اسکول میں سائنس پڑھتے ہو، تمہارے خیال میں یہ کیا چیز ہے۔“ لڑکے نے سانپ کی طرف غور سے دیکھا اور کہا: ”یہ یقیناً کچھو ہے جو عموماً جنگل کی گھاس میں پایا جاتا ہے۔“ بگ بلی نے اپنے بیٹے سے کہا: ”یہ جو کچھ بھی ہے، اسے مار کر باہر پیچیک دو۔“ بوی اٹھا اور اپنا جوتا نکال کر اس جانور کو مارنے چلا۔ بل کیمرون کے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے کہا: ”ذرا رک جاؤ اور مجھے ایک ڈھکن والا مرتبان دو۔“ مرتبان آیا تو بلی اٹھا اور بہت احتیاط اور پھرتی سے سانپ کو مرتبان میں منتقل کر دیا۔ سانپ بھی آئرلینڈ کے سرد موسم سے کچھ ست ہو گیا تھا۔ بلی کے بیٹے نے پوچھا: ”ابو آپ اس کا کیا کریں گے؟“ بلی نے کہا: ”ہمارے گروہ میں ایک کالا بھارت سے آیا ہے، وہاں بہت سانپ ہوتے ہیں۔ میں اُس کے ساتھ مذاق کروں گا۔ وہ تو شاید خوف کے مارے مر ہی جائے گا۔“ اس نے جیکٹ پہنی، کھانا لیا اور بگ میں پھر سانپ والے مرتبان کے ساتھ رکھ دیا۔ پھر وہ اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ وہاں سب لوگ مع رام لعل موجود تھے۔ ٹرک میں سوار ہو کر یہ پارٹی کام والی جگہ پر روانہ ہو گئی۔ وہاں کام شروع ہونے سے پہلے چائے کے دوران بل کیمرون نے چپکے چپکے دیگر لوگوں کو بھی بتا دیا کہ وہ اس کالے کے ساتھ کیا مذاق کرنے والا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے سوچا کہ یہ ایک بے ضرر کیڑا ہے، رام لعل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لہذا ایسے مذاق میں کوئی حرج نہیں۔ کھانے کے وقفے میں سب لوگ حسبِ معمول دائرے کی شکل میں بیٹھے۔ رام لعل نے کچھ خیال نہ کیا لیکن باقی لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اس نے اپنا لٹچ باکس گھنٹوں پر رکھا اور اسے کھولا۔ سینڈویچ اور سیب کے بچے چھوٹا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ رام لعل کی زبردست چیخ سے علاقہ گونج اٹھا اور ساتھ ہی سب مزدور بے ساختہ زور دار قہقہے لگانے لگے۔ رام لعل نے گھبرا کر اپنا لٹچ باکس زور سے ہوا میں اچھال دیا۔ سانپ اور سینڈویچ تمام چیزیں چاروں طرف گھاس میں گر پڑیں۔ رام لعل چیختے ہوئے کھڑا ہو گیا اور بولا ”یہ سانپ بہت زہریلا اور خطرناک ہے۔“ سب لوگ پھر

نپولین مصنف: علی

رہی تھی۔ جب وہ آواز اُس کے عین نزدیک آگئی تو کسی نے ایک جھٹکے سے اُس کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھول دی۔ اچانک روشنی ہونے سے سمور فروش کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، تب اُس نے نپولین کو دیکھا جو اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُس کے مقابل کھڑا تھا۔ اُس نے نپولین کے لب وا ہوتے دیکھے۔ وہ نرم لہجے میں بول رہا تھا ”اب تمہیں پتا چل گیا؟“

کو پناہ دی تھی تو وہ نپولین کی جانب گھوم گیا اور شرمیلے لہجے میں گویا ہوا ”میں اتنے عظیم آدمی سے یہ سوال پوچھنے پر معذرت چاہوں گا! لیکن سمور کے اِس ڈھیر کے نیچے جب آپ کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگلا لمحہ یقینی طور پر آپ کی زندگی کا آخری لمحہ بھی ہو سکتا تھا تو آپ کو کیا محسوس ہوا تھا؟“ نپولین جو اب پوری آن بان کے ساتھ تن کر کھڑا ہو چکا تھا، سمور فروش کے اِس سوال پر غصے میں آگیا اور برہمی سے بولا ”تمہیں مجھ سے، بادشاہ نپولین سے، یہ سوال کرنے کی ہمت کیوں کر ہوئی؟“

پھر وہ اپنے محافظوں سے مخاطب ہوا ”محافظو! اس گستاخ شخص کو باہر لے جاؤ۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو اور اسے گولی مار دو! میں بذاتِ خود اس پر فائر کھولنے کا حکم دوں گا۔“ محافظوں نے اُس بے چارے سمور فروش کو دیوبچ لیا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ پھر اُسے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ سمور فروش کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، البتہ اُس کے کانوں میں محافظوں کے حرکت کرنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں جو دھیرے دھیرے ایک قطار میں کھڑے ہو کر اپنی رائفلیں تیار کر رہے تھے۔



ساتھ ہی اُسے سرد ہوا کے جھونکوں اور کپڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہوا کے تپیلے اُس کے لباس سے ٹکرا رہے تھے اور اُس کے گال بچ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کی ناگئیں کپکپا رہی تھیں اور وہ اُن پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تب اُس کے کانوں میں نپولین کی آواز سنائی دی جس نے کھکارتے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور آہستگی سے بولا ”ہوشیار... شت باندھ لو۔“ اُس لمحے میں یہ جانتے ہوئے کہ اُس کے تمام احساسات و جذبات اُس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے ہیں، سمور فروش کے اندر ایک ایسا احساس نمودیر ہونے لگا، جسے بیان کرنے سے وہ قاصر تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو گئے۔

اُسے قدموں کی چاپ سنائی دی جو اُس کی جانب بڑھ

یہ اُس دور کی بات ہے جب نپولین نے روس پر حملہ کیا تھا۔ اُس کے فوجی دستے ایک اور جھوٹے سے قصبے میں جنگ میں مصروف تھے۔ اتفاق سے نپولین اپنے آدمیوں سے بچھڑ گیا۔ کاسک فوج کے ایک دستے نے نپولین کو پہچان لیا اور شہر کی پُرجھ گلیوں میں اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔ نپولین اپنی جان بچانے کے لیے دوڑتا ہوا ایک بگلی گلی میں واقع ایک سمور فروش کی دکان میں جا گھس۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ دکان میں داخل ہونے کے بعد جوں ہی اُس کی نگاہ سمور فروش پر پڑی وہ بے چارگی سے کراہتے ہوئے بولا ”مجھے بچالو! مجھے بچالو! مجھے کہیں چھپا دو۔“ سمور فروش بولا ”جلدی کرو! اُس گوشے میں سمور کے ڈھیر کے اندر چھپ جاؤ!“ پھر اُس نے نپولین کے اوپر اور بہت سے سمور ڈال دیے۔



ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کاسک فوجی دستہ دندناتا ہوا اُس کی دکان میں آگھسا اور فوجی چیختے لگے ”وہ کہاں ہے؟“ ”ہم نے اُسے اندر آتے ہوئے دیکھا ہے؟“ سمور فروش کے احتجاج کے باوجود اُن فوجیوں نے سمور فروش کی دکان الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ نپولین کی تلاش میں انھوں نے دکان کا چپا چپا چھان مارا۔ وہ اپنی تلواروں کی نوکیں سمور کے ڈھیر میں گھساتے رہے لیکن نپولین کو تلاش نہ کر پائے۔ بالآخر انھوں نے اپنی کوشش ترک کر دی اور واپس چلے گئے۔ کچھ دیر بعد جب سکون ہو گیا تو نپولین سمور کے ڈھیر میں سے ریختا ہوا باہر نکل آیا۔ اُسے کسی قسم کا کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔

عین اسی لمحے نپولین کے ذاتی محافظ بھی اُسے تلاش کرتے ہوئے وہاں آن پہنچے اور دکان میں داخل ہو گئے۔ سمور فروش کو جب اندازہ ہو گیا کہ اُس نے کس عظیم شخصیت

ہائی ٹیک

مصنف: علی

چارلی چپلن ایک لیجنڈ آرٹس تھا اس نے بہت کم عرصے میں اپنی سوچ اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر بہت کچھ پروڈیوس کرنے کے بعد دکھا دیا کہ دنیا میں ہر طرح کے انسان جیسے ہیں اس کی کامیابی فمیں صرف انٹرٹینمنٹ ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی تھیں اسکی نقالی آج بھی دنیا بھر میں کی جاتی ہے۔ تھیٹر، سٹیج شو، سنیما اور ٹیلی ویژن نے نیا ٹرینڈ لا کر دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے لیکن ساتھ ساتھ آج بھی کئی لوگ ان چیزوں سے شدید نفرت کرتے اور آرٹسٹوں کو میراثی اور کبوتر وغیرہ کہتے ہیں حالانکہ آرٹسٹ وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں انسان ہونے کے ساتھ اپنے اندر جذبات اور احساسات کا سمندر رکھتے ہیں اور آرٹسٹ سے نفرت کرنا انسانیت سے نفرت کرنے کے مترادف ہے۔ کئی برسوں تک سنیما میں اگرچہ ہر دور میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ نیا دکھایا جاتا اور شائقین محفوظ ہوتے لیکن ٹی وی آنے کے بعد انسانوں کی سوچ یکسر بدل گئی کیونکہ چھوٹی سکرین پر ایڈورٹائزنگ کی بدولت دنیا کی ہر اچھی اور بری شے نشر کی جانے لگی ایک طرف اگر معلومات کا خزانہ ہوتیں تو دوسری طرف کئی انسانوں کے لئے منفی بھی ثابت ہوتیں



ساتھ اور ستر کی دہائی میں ٹی وی پر ہر نئی شے کو دیکھ کر ہر ایک کی زبان پر یہ ہوتا کہ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے، سائنس کتنی ترقی کر گئی ہے وغیرہ۔ بات کچھ عجیب سی ہے کہ کچھ لوگ سائنسی ایجادات کو ماننے ہوئے عیش عیش کرتے ہیں ایجادات سے مستفید ہوتے ہیں اور پھر اسے برا بھی سمجھتے ہیں۔ سائنس اگرچہ خود ترقی نہیں کرتی بلکہ انسان اپنے دماغ اور سوچ کو بروئے کار لا کر اس کھوج میں رہتا ہے کہ کچھ نیا ایجاد کیا جائے یہ کہنا غلط نہیں کہ ہر انسان ایک سائنس دان ہے یعنی اسکا دماغ اتنا فاسٹ ہے کہ وہ چاہے تو ہر سینکڑ نئی سوچ سے دنیا تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن افسوس کہ کچھ لوگ اپنا دماغ استعمال کرتے ہیں اور کچھ جانتے ہی نہیں کہ دماغ آخر ہوتا کیا ہے۔ مستقبل قریب یعنی دو ہزار پچیس تک سائنسی دنیا میں نیا انقلاب آجائے گا آنے والے سات آٹھ برسوں کے اندر ہم کئی پرانی اشیاء سے محروم ہو جائیں گے اور یہ اشیاء ماضی کا حصہ کہلاتے ہوئے اینٹک شمار کی جائیں گی جیسے کہ آج کل ٹرانزسٹر یا ٹیپ ریکارڈر وغیرہ کا کہیں نام و نشان نہیں ہے آج کی جزیشن نہیں جانتی کہ کیٹ ریکارڈر کیا ہوتا ہے۔ ہائی ٹیک یعنی ہائی ٹیکنالوجی دنیا بھر میں سپیڈ پکڑ چکی ہے اور ہر انسان کی ضرورت بھی بن گئی ہے کیونکہ جتنی تیزی سے سائنس ترقی کر رہی ہے انسان کیلئے سہولت پیدا ہو رہی ہے اتنی تیز رفتاری سے انسان ست اور کما ہوتا جا رہا ہے۔ لیکویڈ کرسٹل ڈسپلے جنہیں ایل سی ڈی ٹیلی ویژن کہا جاتا ہے حیرت انگیز طور پر اپنی مخصوص بناوٹ سے دنیا بھر میں مقام حاصل کر چکے ہیں اور موٹی فونڈ والے ٹی وی کو کچرے کے ڈبے یعنی ری سائیکلنگ کمپنیز کو واپس کر دیا گیا ہے آج ماضی کا حصہ بن چکے ہیں کیونکہ ایل سی ڈی ٹی وی بہت پتلے یعنی سارٹ ہونے کے ساتھ بہت کم جگہ لیتے اور آج کل بہت ارزاں قیمت پر دستیاب ہیں اسکے باوجود گزشتہ برس ایل جی کمپنی نے مستقبل کیلئے ایک نیا ٹی وی متعارف کروایا ہے جسے اورگائیک لائٹ ایبلمنگ ڈاؤنڈ یعنی او ایل ای ڈی کانام دیا یہ نیا ٹی وی اپنی منفرد لائٹس سے فکشن کرے گا جس سے انرجی کی بچت ہوگی اور آج کل کے فور کے ٹی وی سے زیادہ صاف وشفاف تصویر پیش کرے گا علاوہ ازیں یہ حیرت انگیز ٹی وی کاغذ کی طرف ہارڈک ہونے کیساتھ رول اور فولڈ کیا جاسکے گا کمپنی کے ترجمان کا کہنا ہے اس ڈیویو سیریز یعنی وال پیپرز کی موٹائی اندازً دو سے تین ملی میٹر ہوگی مقناطیسی سسٹم سے دیوار میں ایڈجسٹ کیا جاسکے گا عام استعمال کے لئے اس سال کے آخر میں مارکیٹ میں دستیاب ہو گا۔ لیڈ لیپ۔ عام بلب یا انرجی سیور لیپس بہت جلد مارکیٹ سے ہٹا دئے جائیں گے انکی جگہ پر کرنے کیلئے او لیڈ لیپ دستیاب ہوئے ان نئے لیپ کا موازنہ ایل جی کے ٹی وی سسٹم سے کیا جا سکتا ہے معروف کمپنیز فلیس اور اوسرام بہت جلد یہ لیپ متعارف کروائیں گی۔ سٹورج میڈیا۔ آج کل سی ڈی، ڈی وی ڈیز ڈسک کے علاوہ یو ایس بی سٹکس پر تمام ڈیٹا منتقل کرنے کے بعد سٹورج کیا جاتا ہے جبکہ آنے والے برسوں میں یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا اور اسکی جگہ بوکس، ایمزون اور گوگل کمپنیز ایک نیا سٹورج میڈیا متعارف کروائیں گے جس میں وائی فائی سسٹم کے تحت آن لمیٹڈ ڈیٹا سٹور کیا جاسکے گا۔ گیم کونزولز۔ گیمز کھیلنے والے یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کنزولر یا دیگر کونزولز کے بغیر اپنی من پسند گیم ایکس بوکس یا پلے سٹیشن پر کھیل سکیں لیکن مستقبل قریب میں این وائی ڈیٹا کمپنی کونزولز فری کلاؤڈ گیم سسٹم متعارف کرواتے گی جس سے گیمز کھیلی جائیں گی یہ کمپنی جی فورس ناؤ گیم سٹریمنگ سروس کے ذریعے گیم کھیلنے والوں کیلئے سہولت پیدا کرے گی علاوہ ازیں اپ لوڈ اور ڈاؤن لوڈ سسٹم کو بھی ریوٹ سرور کے ذریعے ہائی ٹیک طریقے سے استعمال کیا جاسکے گا کیبل چارجز۔ سیمنگ کمپنی نے حال ہی میں کیبل فری چارجز متعارف کروایا ہے ایک مخصوص پیڈ کے ذریعے سارٹ فونز، لیپ ٹاپ اور دیگر الیکٹرونک انٹرومنٹس چارج کئے جا سکیں گے، پلگ یا ایڈاپٹر کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی، اپیل کمپنی نے بھی کیبل فری ایک نئی ٹیکنالوجی متعارف کرائی ہے جس سے تمام آلات کیبل کے بغیر چارج کئے جائیں گے۔ ریوٹ کنزولز۔ پروگرامنگ

اور دیگر فنکشن کے لئے ریوٹ کنزول کی بجائے وائس سسٹم سے تمام آلات فنکشن کریں گے اس سسٹم کیلئے سینسور استعمال کیا جائے گا مثلاً ایکس بوکس یا پلے سٹیشن کو ٹی وی کے والیم سے منسلک کرنے کے بعد وائس کنزول سے استعمال کیا جاسکے گا۔ پلاسٹک کارڈز اور پاس ورڈز سسٹم بھی بہت جلد ختم کرنے کے بعد تمام ڈیٹا سمارٹ فونز پر منتقل کرنے سے ہر قسم کی شاپنگ کی جاسکے گی ہائیو میٹرک سینسر اور ہائی ٹیک الفا بیٹک سسٹم کے علاوہ ٹنگر پرنٹس اور چہرے کی شناخت سے تمام عوامل باآسانی طے پائیں گے۔ انسان ایک طرف کہتا ہے کہ سائنس ترقی کر رہی ہے ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور دوسری طرف سائنسدانوں کو برا بھلا بھی کہا جاتا ہے۔ چارلی چپلن آج زندہ ہوتا تو بہترین ایکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم سائنسدان بھی ہوتا جو ہنستے ہنساتے بہت کچھ دریافت کرتا اور لوگ اس کی تعریف بھی کرتے۔

خواتین کا عالمی دن

مصنف: علی



اس کی سوچ مثبت اور تعمیری ہو۔ اگر وہ اخلاقیات کے اعلیٰ درجہ پہ ہو تو وہ عورت کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ یہ اُس کی تربیت ہے جو اسے عورت کی عزت کرنا سکھاتی ہے۔ اور مرد کی تربیت ماں کی گود سے شروع ہو کر خاندان کے ماحول سے ہوتی ہوئی معاشرے کے طور طریقوں پہ ختم ہوتی ہے۔ مثبت سوچ کے مالک لوگ نہ صرف عورت کو عزت دیتے ہیں بلکہ انہیں خاندان اور معاشرے کا نہایت اہم رکن کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں وہ اپنی ماں، بیوی اور بہن اور بیٹی ان سارے حوالوں سے عورت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر معاشرے کے مثبت پہلوؤں پہ روشنی ڈالتے ہوئے کئی روشن مثالوں کو بیان کریں تو اسی معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے جدوجہد آزادی میں سرگرم رہنے والی خاتون ”فاطمہ جناح مارو ملت“ کہلائیں۔ معاشرے کی فلاح اور رہنمائی کا بیڑا سر پہ اٹھائے ہوئے دن رات مصروف عمل رہنے والی بلیٹس ایڈھی ایک منفرد اور اعلیٰ سوچ رکھنے والے عظیم انسان کی بیوی ہے۔



ادبی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام رکھنے والی عظیم ادیبہ بانو قدسیہ کو بھی اشفاق احمد جیسے ایک اعلیٰ پایے کے محقق اور مدبر انسان کی معاونت حاصل رہی۔ افواج پاکستان میں بھرتی ہونے والی خواتین جو اپنی زندگی داؤ پہ لگا کر فرض کی تکمیل کے لیے ہر روز ڈیوٹی پہ موجود ہوتی ہیں۔ انہی میں سے ایک فلائنگ آفیسر مریم مختیار اس وطن عزیز کیلئے جان کا نذرانہ پیش کرنے والی باہمت بیٹی کا جنم بھی تو اسی معاشرے میں ہوا تھا۔ اناک اور نیوکلئیر فرنس میں مہارت رکھنے والی اس قوم کی غیور ”بیٹی“ ڈاکٹر عافیہ صدیقی، بھی تو کسی باپ کی بیٹی، کسی شوہر کی بیوی اور کسی بیٹے کی ماں ہے۔ کسی تہذیب میں تو مرد عورت کی تعلیم میں روکاوٹ بنا تو کسی جگہ اُسی کی سپورٹ کرنے میں سرِ فہرست رہا۔ عورت اس معاشرے کا نہایت اہم جزو ہے۔ جس کے بغیر نہ نسلیں چل سکتی ہیں نا قومیں بن سکتی ہیں۔ عورت کے وجود سے ہی زندگی ہے سوال یہ ہے کہ ”عورت آخر چاہتی کیا ہے؟“ عورت عزت چاہتی ہے تحفظ چاہتی ہے۔ عورت تعلیم حاصل کر کے زندگی کی دوڑ میں مرد کے ساتھ چلنا چاہتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عورت کا حقیقی مقام سمجھتے ہوئے جو ایک ماں بھی ہے اور ایک بیٹی بھی وہ بیوی ہے اور بہن بھی و معاشرے کی ترقی میں عورت کے کردار کو سمجھا جائے۔ تعلیم عورت کا بنیادی حق ہے۔ پڑھی لکھی ماں ہی پڑھے لکھے معاشرے کو جنم دے سکتی ہے۔ عورت کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے معاشرے اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو روشن بنایا جا سکتا ہے اور ملک کی ترقی اور خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہو سکتا ہے۔



مارچ کی 8 تاریخ خواتین کے عالمی دن کے طور پر منائی جاتی ہے ایک طرف اللہ تعالیٰ نے جنت ماں کے قدموں میں رکھ دی ہے تو دوسری طرف آج بھی ہمارے معاشرے میں عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے عورت کے حقوق پہ بحث کوئی نئی بات نہیں کئی صدیوں سے عورت اپنے حقوق کے حصول کے لیے جہد مسلسل میں ہے۔ وہی حقوق جن کی ادائیگی آج سے 14 سو سال پہلے اسلام کر چکا۔ اسلام جس نے عورت کو عزت و مقام دیا۔ ورنہ اسلام کے آغاز سے پہلے عرب میں عورت کو زندہ گاڑ دیا جاتا تھا۔ لڑکی کی پیدائش ایک محسوس سختی سمجھی جاتی تھی۔ عورت کو فساد کی جڑ سمجھا جاتا تھا۔ ہندو معاشرہ جو آج بھی عورت کو مکمل حقوق دینے سے قاصر ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد عورت دوبارہ سے نارمل زندگی گزارنے کا حق نہیں رکھتی۔ عورت کو ”سستی“ جیسی بے بنیاد اور غیر انسانی رسم کے مطابق زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ مغربی معاشرے کی عورت جو کبھی Feminism کی قائل تھی اب اُس معاشرتی آزادی سے تنگ آتی دکھائی دے رہی ہے۔ فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک میں عورت کو ووٹ ڈالنے کی آزادی نہیں تھی کچھ سال قبل عورت کو ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہوا۔ عورت جو مغربی معاشرے میں مرد کے شانہ بشانہ معاشی ریس میں چلتی چلتی اب تھک چکی ہے۔ اس معاشرے میں جہاں عورت کو مرد کے برابر کام کرنا پڑتا ہے۔ جہاں زندگی کی ساری سہولیات کے حصول کے لیے انسان دن رات کام تو کرتا ہے مگر پیسے اور کام کی اس دوڑ میں کہیں رشتے اور خاندان بہت دور جا چکے ہیں۔ مشرقی معاشرہ جو ایک طرف تو غیرت کے نام پر بہن و بیوی اور بیٹی کا قتل جائز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف اسی معاشرے میں کسی کی بھی بیوی، بہن اور بیٹی سڑک و بس سٹاپ اور گلی بازاروں میں چلتی پھرتی خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے۔ اس کم پڑھے لکھے اور غیر ترقی یافتہ معاشرے میں اگر کوئی لڑکی بس کے انتظار میں ”بس سٹاپ“ پہ کھڑی ہو تو ہر عمر کا مرد اُسے لفٹ دینے کیلئے تیار کھڑا ہوتا ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں کسی مرد کو اپنی غیرت اور عزت کو محفوظ چاہیے مگر کسی دوسرے کی عزت انہی سڑکوں پہ رُسوا کی جاتی ہے۔ آج اکیسویں صدی کے اس نام نہاد مہذب معاشرے میں عورت کی تعلیم اس کے حقوق اور آزادی پہ بات کرنے والوں نے کیا صحیح معنوں میں عورت کو عزت دینے کی کوشش کی؟ عورت کی تعلیم جس کی بات آج مغربی معاشرہ کرتا ہے اس کے بارے میں احکام تو اسلام چودہ سو سال قبل دے چکا ہے۔ نبی کریمؐ کے ارشاد کے مطابق ”علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے“ ایسا پریکٹیکل مذہب جو صدیوں پہلے ہی عورت کے حقوق متعین کر چکا جو عورت کو تعلیم کا حق دے چکا۔ اُسی مذہب کے پیروکار عورت کو عزت دینے میں اتنے بخیل کیوں؟ اسی پاکستان میں جو بنا ہی اسلام کے نام پر تھا آج بھی اس معاشرے میں جسمانی اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہیں اسے درشت میں سے محروم رکھا جاتا ہے تو کہیں غیرت کے نام پہ اس کا خون بہایا جاتا ہے۔ دنیا میں ہر چیز کے کچھ منفی اور کچھ مثبت پہلو ہوا کرتے ہیں۔ مرد چاہے مغربی معاشرے کا ہو یا مشرقی معاشرے کا اگر

یہی صورتحال پانامہ لیکس کے حوالے سے بھی درپیش ہے ، طرح طرح کے تبصرے پڑھنے کے بعد بندہ خواہ خواہ ہی خود کو جج سمجھ بیٹھا ہے اور ان تبصروں کی روشنی میں فوراً فیصلہ صادر کر دیتا ہے کہ نواز شریف کو عہدہ سے ہٹانے کے علاوہ عمر بھر کیلئے نااہل قرار دیا جاتا ہے ۔ ان میں سے بعض تبصرے تو بڑی ہی دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر عدالت عظمیٰ کی جیوری وہ پڑھ لے تو ان کی فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی ، یقیناً کریں کہ قانون، آئین کی تشریحات جس قدر دلچسپ انداز میں فیس بک پر نظر آتی ہیں اس کا عشرِ عشر کوئی حقیقی ماہر قانون و آئین نہیں ہو سکتا۔

ایک تبصرہ نگار سے اچھی خاصی سلام دعا ہے، انکے ہر ادبی، سیاسی تبصرہ پر واہ واہ کریولوں کی تعداد ہمیشہ سینکڑوں میں ہوتی تھی، ایک دن ہم نے مشورہ دیا کہ 'آپ اچھا لکھتے ہیں آپ کی تحریروں، تبصروں میں جامعیت ہوتی ہے لہذا کسی قومی روزنامہ کا قصد کر لیں' انہوں نے بڑے ہی فخریہ انداز میں جواب دیا 'انشا اللہ آپ آئندہ چند دنوں میں کسی بڑے قومی اخبار میں میری تحریر پڑھ سکیں گے' کچھ دن انتظار یہیں گزر گئے پھر پتہ چلا کہ ایک قومی اخبار انچارج ادبی صفحہ نے ان کے تبصرہ پر عجیب سا تبصرہ کیا 'کچھ حصہ تو ڈاکٹریوس بٹ کی تخلیقات سے متاثرہ نظر آتا ہے، کچھ جملوں کی کانٹ چھانٹ فلاں فلاں رائٹر کے زیر اثر ہے، بعض بیروں پر فلاں فلاں ادبی لکھاری نے پہلے سے ہی قبضہ بھایا ہوا ہے اور جملوں کی کاٹ حسن ثار سے مستعار لی گئی ہے' اس تبصرہ نگار کے تبصرہ پر اتنا بھرپور تبصرہ یقیناً بہت ہی دلچسپ تھا کہ اس کے بعد مزید کسی تبصرے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی

اس کے بعد یقیناً بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ ہمارا ایک ڈیڑھ گھنٹہ ایسی بحث مباحثہ کے پکر میں گزر گیا، گو کہ ابتدا میں یہ کام بڑا ہی دلچسپ تھا لیکن بعد میں یوریت ہونے لگی تو ہم نے فیس بک سے جان چھڑا مناسب سمجھی۔ خیر اگلے دن زید نے آن لائن ہوتے ہی پھر کہا کہ "واہ فضیلین بھائی مزہ آگیا آپ نے بکر کو خوب مزہ پکھلایا" ابھی ہم ان کے تعریفی جملوں کا طلف اٹھا رہے تھے کہ بکر صاحب نے آن لائن ہوتے ہی تقریباً ایسے ہی ملتے جلتے میج کئے، ہم نے دونوں کی تعریفیں دونوں ہاتھوں سے سمیٹیں اور گلے سے لگالیں۔

صاحبو! سوشل میڈیا پر محض یہ دو ہی ایسے کردار نہیں بلکہ روزانہ ایسے کردار سے واسطہ پڑتا ہے، جن کی فرمائش بھی عجیب ہوتی ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے لکھے پر واہ واہ کرنے کے علاوہ چند ایک جملے بھی لکھے جائیں تاکہ ان کی پوسٹ کی گئی "تخلیق نما شے" کی اہمیت و افادیت بڑھ جائے۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑیے یہ دیکھئے کہ واہ واہ کی خواہش کسے نہیں ہوتی لیکن سوشل میڈیا خاص طور پر فیس بک کے حوالے سے عجب طرز کی کہانیاں بھی سامنے آتی ہیں اس دنیا کے دانشور جس قدر سچے اور پکے ہیں اسی قدر واہ واہ کریں والوں کی حالت بھی ویسی ہی ہے۔ پاناما کیس سے لیکر پبلی ایس ایل تک ، اگر فیس بک دانشوروں کے تبرے پڑے جائیں تو بندہ خود سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر اتنی ہی دانش ان افراد میں ہوتی تو قوم کی یہ حالت نہ ہوتی۔ گویا دانش بچاری بھی دانشوروں کی عقل پر ماتم کرتی نظر آتی ہے۔ 2013 کے انتخابات کے دوران بھی عالم کچھ ایسا ہی تھا ، طرح طرح کے تبصروں سے ہم نے نتیجہ اخذ کیا کہ اب کی بار نہ تو پیپلز پارٹی جیت پائے گی اور نہ ہی مسلم لیگ کے سر کامیابی کا سہرا سجے گا ، عمران خان بھی بس فتنی فتنی کامیابی حاصل کریگے ؟ لیکن اصل کامیابی ہوگی کس کی؟ یہ سوال الیکشن کے نتائج تک ادھورا رہا لیکن جو نبی انتخابات ہوئے تو پتہ چلا کہ مسلم لیگ ن واضح اکثریت کے ساتھ حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہے۔ سوال وہی کہ اگر فیس بک کے دانشوروں کے اٹھائے گئے چاند سورج کے بارے قیاس کیا جائے تو یہی لگتا ہے کہ ابھی دن کو رات اور رات کو دن بنا دیں گے۔

ایک ایسے ہی فیس کی دانشور سے بات چیت ہو رہی تھی فرمانے لگے " پی ایس ایل کی ٹیوں کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کراچی کنگز، لاہور قلندر جیسی ٹیوں پر خود انہیں بھی اعتبار نہیں، پشاور زلی، کوئٹہ گلیڈی ایٹرز کے جیتنے کے بھی امکانات کم ہیں، اسلام آباد یونائیٹڈ بھی گزشتہ برس جیسی مضبوط ٹیم نہیں ہے" اس تبصرہ نگار سے ہم نے پوچھا " پھر کون جیتے گا " یہ سوال پڑتے ہی انہوں نے فرمایا " اوہ ہو وہ ہو،

مصنف: علی

زید سے ہماری سلام دعا یا گپ شپ فیس بک کے ذریعے ہوئی، گپ شپ بھی بذریعہ میٹج ہوئی رہی، دوران گپ شپ پتہ چلا کہ یہ صاحب کسی مذہبی جماعت کے کارکن اور ایک بہت بڑے مذہبی رہنما کے ماننے والے ہیں ایک دن انہوں نے ہمیں فیس بک کے ان باکس میں میٹج کیا کہ "تخلین بھائی! میری وال پر فلاں صاحب نے میرے قائد کے بارے میں عجیب و غریب جملے لکھ رکھے ہیں، بلیز آپ اسے جواب دیں" ان کی بات نے حیران کر دیا، ہم نے عرض کی "حضور! دیکھیں ہو سکتا ہے کہ آپ کے قائد کے حوالے سے ہمارے بھی تحفظات ہوں اس لئے آپ براہ کرم ہمیں معاف رکھیں،" زید نے کہا کہ "آپ ایسا کریں میری وال پر آکر ایک دفعہ دیکھ لیں کہ اس نے کیا ککواس کر رکھی ہے، اس کے بعد آپ مجھے اس کا جواب لکھ کر ان باکس کریں" تجویز خاصی معقول تھی اس لئے ہم نے حامی بھری، اتفاق دیکھئے کہ ان کی وال پر عجیب و غریب تبصرے کرناوالے صاحب (انہیں آپ بکر سمجھ لیں) بھی ہمارے فیس کی دوست تھے، بکر کے تبصرہ کو غور سے پڑھا اور پھر اس کا اردو فانٹ میں جواب لکھ کر زید کو ان باکس کر دیا، دو تین مرتبہ یہ کام کرنے کے بعد اچانک بکر کی طرف سے ان باکس میں میٹج ملا "تخلین بھائی! یہ لڑکا زید جو ہے، اس کی وال پر میری بحث چل رہی ہے اچانک اس نے اتنے دلائل کے ساتھ جواب دینا شروع کر دیا کہ میں حیران ہوں، آپ بلیز میری حملت میں لکھ دیں کیونکہ آپ نے بھی ایک سے زائد مرتبہ اس کے قائد کے حوالے سے کچھ ایسی ویسی باتیں لکھی تھیں" ہم نے عرض کی "حضور! وہ باتیں اس وقت کے حساب سے تھی ہمارا ان کے قائد سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں اس لئے آپ ہمیں معاف رکھیں" بکر نے منت کے انداز میں کہا کہ "اچھا ایسا کریں آپ جواب لکھ کر مجھے ان باکس کر دیں میں خود پوسٹ کر دوں گا"



عورت مصنف: علی



سے بھی محروم ہیں پاکستان کی اکثریت آج بھی دیہات میں رہتی ہے آپ کسی بھی گاؤں چلے جائیں عورت کو دیکھ کر لوگ راستہ بدل لیتے ہیں نظریں نیچی کر لیتے ہیں رکشوں بسوں ٹریلوں میں ان کے لیے سیٹوں سے اٹھ جاتے ہیں بہن بیٹی ماں جی کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں سگریٹ نوشی نہیں کرتے، بلند آواز سے بات نہیں کرتے اگر مرد گئیں مار رہے ہوں تو کسی عورت کے آنے سے خاموش اور مہذب ہو جاتے ہیں، آپ نے اکثر مردوں کے منہ سے ایک فقرہ سنا ہو گا کہ میں بھی بہنوں کا بھائی ہوں میں بھی بیٹی کا باپ ہوں بہنوں بیٹیوں والا ہوں، جس گھر میں بیٹی پیدا ہو گئی تو لوگوں نے شراب نوشی ترک کر دی برائی کے سارے کام چھوڑ دیے دوسروں کی بہنوں بیٹیوں کو اپنی بہن بیٹی سمجھنا شروع کر دیا جس گھر میں بیٹی پیدا ہو جائے بھائی کا باپ مہذب ہو جاتے ہیں، ماں باپ کہتے ہیں آج سے فحش بات نہیں ہو گی اب ہمارے گھر میں بیٹی آگئی ہے آج بھی جب کوئی بیٹی کسی کو بھائی کہہ کر بلا تی ہے تو لوگ اپنی نظریں احترام میں جھکا لیتے ہیں ہمارے معاشرے میں آج بھی طلاق دینے والے مردوں کو اچھوت سمجھا جاتا ہے لوگ ایسے لوگوں سے رشتے ناطے تعلقات استوار نہیں کرتے، عورت کے ساتھ زیادتی پر پورا معاشرہ آتش فشاں بن کر پھٹ پڑتا ہے، ماں بہن بیٹی سے تلخ کلامی پر یا ایک آواز پر مرد اپنے ہی جیسے مردوں کو مار مار کر حالت خراب کر دیتے ہیں آج بھی ہمارے معاشرے میں دواوی نانی ماں خالہ کو عقل شعور کی علامت سمجھا جاتا ہے ان کے مشوروں کے سامنے مرد سرنگوں ہوتے نظر آتے ہیں بیٹی کے رشتے کے مشورے کے وقت برے سے برا آدمی بھی ٹھیک مشورہ دیتا ہے پاکستان جیسے ترقی پذیر معاشرے میں آج بھی عورت یورپ امریکہ سے زیادہ محفوظ ہے، اقوام متحدہ کی ایک قرار دلا کے مطابق 8 مارچ کو ”خواتین کا عالمی دن“ کے طور پر پوری دنیا میں منایا جاتا ہے یہ قرار دار 1956 کو منظور کی گئی خواتین نے اپنے حقوق کے لیے 1907 میں پہلی بار آواز بلند کی اُس دن مارچ کی 8 تاریخ تھی یہ کمزور آواز آگے جا کر توانا ہو گئی پھر اُس کی بازگشت اقوام متحدہ میں بھی گونجی اور یوں یہ دن خواتین کا دن قرار پا یا یہ تو ہے خواتین کے عالمی دن کا پس منظر لیکن پاکستان کے مغرب نواز دانشوروں اور اہل مغرب کی خدمت میں عرض ہے کہ اسلام اُس حوالے سے ثابت شدہ اولیت اور سبقت کا حامل ہے آقا کریم ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع جسے منشور انسانیت کہنا چاہیے میں سرتاج الانبیاء ﷺ نے عورت کی شان اور حقوق کے بارے میں واضح طور پر کہہ دیا تھا سچ تو یہ ہے کہ یورپ افریقہ اور امریکہ میں عورت کی شناخت اور حقوق کے حوالے سے اسلام سے کئی صدیوں بعد آواز اٹھی یورپ میں عورت کے حقوق کی بات کی تاریخ صرف ایک صدی پرانی ہے جبکہ اسلام چودہ صدیاں پہلے عورت کو شناخت احترام اور حقوق دے چکا ہے خطبہ الوداع میں سرور کو نبین ﷺ کا ارشاد ملاحظہ ہو ”اے لوگو سنو تمہارا رے اوپر تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں اِس طرح ان پر بھی تمہارے حقوق، پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جو تمہیں پسند نہ ہو وہ کوئی خیانت نہ کریں اور کھلی بے حیائی کی مرتکب نہ ہوں اور تم انہیں اچھی طرح لباس اور خوراک مہیا کرو، ان کے بارے میں اللہ کا خوف رکھو لحاظ رکھو تم نے انہیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اسی کی اجازت سے وہ تم پر حلال ہیں۔“



اس طرح تاریخ انسانی میں اسلام نے پہلی بار عورت کو مرد کی طرح معاشرے کا کارآمد فرد مانا اس کے

میں خوشگوار حیرت سے اپنے سامنے بیٹھی نوجوان طالبہ کو دیکھ رہا تھا اُس کے چہرے پر شرم و حیا اور اعلیٰ کردار کے پھول کھلے ہوئے تھے لیکن اُس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی اُس کا آہنی عزم مجھے بہت متاثر کر گیا تھا وہ اپنی جوانی کے دور سے گزر رہی تھی جوانی منہ زور ہوتی ہے جوانی میں اپنے خوابوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا جوانی کا منہ زور سیلاب جب چڑھتا ہے تو ماں باپ بہن بھائی بھول جاتے ہیں جوانی میں ہر نوجوان اپنی جوانی اور طوفانی جذباتوں کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے لیکن اِس نوجوان لڑکی کے چہرے اور آنکھوں میں حضرت مریمؑ، حضرت فاطمہؑ کا عکس نظر آرہا تھا میرے سامنے پنجاب یونیورسٹی کی ماسٹر ڈگری کی طالبہ بیٹھی تھی جو اپنی دوست کے ساتھ آئی تھی آنے کا مقصد خدا کا قرب اور اللہ کی رضا تھا باتوں باتوں میں جب میں نے پوچھا بیٹی تم شادی اپنی مرضی سے کرو گی یا ماں باپ کی مرضی سے تو وہ اعتماد سے بھرپور لہجے میں بولی جہاں میرے ماں باپ کریں گے میں وہیں کروں گی میں نے اگلا سوال داغا کیا کوئی لڑکا تمہیں پسند کرتا ہے تو وہ بولی ہاں کرتا ہے لیکن میں شادی اسی صورت میں کروں گی جب میرا باپ خوشی سے اجازت دے گا اور بیٹی بات میں نے اُس لڑکے سے کہہ رکھی ہے کہ اپنا کیرئیر بناؤ پھر میرے والد سے میرا ہاتھ مانگو، اگر وہ مان گئے تو ٹھیک ورنہ تم اپنے گھر، میں اپنے گھر، میں نے پوچھا اگر تمہارے والد صاحب نے انکار کر دیا تو وہ پورے عزم سے بولی میرے لیے میرا باپ سب سے اہم اور قیمتی سرمایہ ہے وہ باپ جس نے میرے لیے اپنی جوانی خرچ کر دی دن رات میرے لیے کام کیا میری نضحی سے نضحی خوشی کے لیے اپنی جان لگا دی اُس باپ بھائی اور ماں کے لیے میں ایسی حماقت سوچ بھی نہیں سکتی میرے لیے میرے باپ کی عزت غیرت سب سے اہم ہے باپ کا ذکر کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں عقیدت و احترام کی قدیلیں روشن ہو گئی تھیں اور میں رنک کر رہا تھا اُس باپ ماں بھائی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے ایسی شرم و حیا والی کردار کا پیکر بیٹی عطا کی تھی۔ لڑکی کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر چلی گئی میں فخر محسوس کر رہا تھا کہ ایسے گوہر نایاب عظیم بیٹیاں صرف عالم اسلام اور پاکستان میں ہی ملتی ہیں میں جب بھی یورپ یو کے جاتا ہوں تو وہاں جب پاکستانی ماں باپ کی بچیوں کو مغربی رنگ میں رنگے دیکھتا ہوں تو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ہم پاکستانی کتنے مقدر والے ہیں جہاں بیٹیاں بہنیں بھائیوں اور باپ کی غیرت کے لیے پتہ ہی نہیں چلتا کب جوانی سے بڑھاپے کی دواوی میں آت جاتی ہیں پاکستانی ماں باپ شرم و حیا کے پیکر ان بیٹیوں سے سرفراز ہیں۔ کچھ لوگ یہ نہیں جانتے کہ پاکستان کی ماڈرن عورت جو مغرب نوازی کی چگالی کر تی نظر آتی ہے وہ یہ بھول جاتی ہے کہ بلاشبہ مردوں کی برتری کے اِس معاشرے میں عورت اپنے اصل مقام اور حقوق سے پوری طرح فیض یاب نہیں ہے لیکن اِس کے باوجود عورت کو جو مقام یہاں حاصل ہے یورپ یو کے اور امریکہ کی عورتیں اِس عزت اور مقام کی خوشبو

مالی مفادات اخلاقی قانونی حقوق کا تحفظ کیا آج ہماری ماڈرن عورتیں جو یورپ جیسی آزادی سڑکوں پر مانگتی ہیں تو ان کی عقل پر ماتم کرنے کو دل کرتا ہے یورپ جہاں عورت جنسی مشین سے زیا وہ کچھ بھی نہیں، جہاں عورت کا ہر بچہ پہلے سے مختلف نقش و نگار کا ہوتا ہے، جہاں عورتیں شادی سے پہلے ماں بن جاتی ہیں، جہاں عورت ماں بہن بیٹی نہیں بلکہ جنسی پارٹنر ہیں، آج ہماری ماڈرن عورتیں یورپ کی سی آزادی چاہتی ہیں جہاں عورت گھر کی چار دیواری سے نکل کر ماڈلنگ اور اشتہار بازی میں استعمال ہوتی ہے، عورت گھر کی بجائے کلب تھیٹر ڈانس ہال اور بازار میں نظر آتی ہے یورپ میں طلاق کی شرح، بوائے فرینڈ بنانے کی دبا، کم عمر بچیوں پر جنسی تشدد، بن بیاہی مائیں، ماں باپ کی شناخت سے محروم بچے، بوڑھی بے بس عورتوں کی تنہائی کی ہولناک تصویریں ہیں، ہماری ماڈرن عورتوں سے سوال ہے کہ کیا امریکہ یورپ کی پوری انسانی تاریخ میں ایک بھی عورت فاطمہ بنت محمد ﷺ کے قدموں سے اٹھنے والے غبار کو پہنچ سکتی ہے جو بچپن سے سردار الانبیاء ﷺ کی دیکھ بھال کرتی تھیں تاریخ انسانی کے سب سے بڑے شجاع کو زہرہ بکتر پہناتی تھیں تاریخ کے سب سے بڑے شہید کی ماں بنیں جس نے عورت کو اس کے اصل مقام اور شان سے روشناس کرایا۔

